دینی مدارس میں دنیوی تعلیم

کارواج پڑ جانے کے عواقب ونتائج

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

آج کل مدارس کی دنیا میں ایک اصطلاح نکل چلی ہے: ''دینی و دنیوی تعلیم کا حسین امتزاج'' بعض ستم ظریف تو اسے ''دینی وعصری تعلیم کا (یا قدیم و جدید کا) حسین امتزاج'' سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں... اور اس مضمون کے آخر تک قارئین بھی انشاء اللہ جان لیں گے... کہ جو دنیوی تعلیم ہمارے ہاں رائج ہے، اسے آپ کچھ کہہ لیں، لیکن ''جدید'' یا ''عصری'' نہیں کہہ سکتے، یہ تو نہ جدید ہے، نہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق۔ یہ ایسی فرسودہ، ازکار رفتہ اور عہد کہن پر اڑے رہنے کی مثال ہے کہ خود اس کے ترتیب دینے والوں سے لے کر پڑھنے پڑھانے والوں تک کسی کو اس سے مطمئن نہیں پایا، نہ کسی ایک بڑے میاں یا چھوٹے منے نے اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ اس منہج تعلیم سے وابستہ تجربہ کار حضرات سے مل لیجئے... یا کسی بھی پوزیشن ہولڈر طالب علم یا طلبا کا تبصرہ سن لیجئے جو ہر سال الفاظ بدل بدل کر شائع ہوتے رہتے ہیں... تواتر اور تسلسل کے ساتھ ایسا اجماعی اور اتفاقی عدم اطمینان اور بیزار کن صورتحال دیکھنے کو ملے گی جو بجائے خود عصرِ حاضر میں ''اجماع صریح'' یا کم از کم ''اجماع سکوتی'' کی زندہ عصری مثال ہے۔

ایک طرف اس شعبے کے اکابر و اصاغر، بابوں اور چھنکوں، مسٹروں اور مسزوں کے بے مثال اتفاق کا تو یہ حال ہے، دوسری طرف ہماری مدارس کی برادری کو نہ جانے سامری کے اس بچھڑے کی محبت کیوں دل میں گھر کر گئی ہے کہ جسے دیکھو ''اولی + میٹرک'' کو اپنے مدرسے کے اشتہار کے سرنامے پر لکھنا اپنا امتیاز سمجھتا ہے۔ یہ عاجز اس خطرناک ''پلس'' رجحان کے متعلق خود کچھ کہنے سے پہلے اپنے اکابر کے وہ ملفوظات جو اس ''امتزاجِ حسن'' کے بارے میں ہیں، نقل کرتا ہے، پھر چند باتیں عرض کرے گا جو تجربے سے سامنے آئیں۔ شاید کہ یہ مدارس کی برادری کے لئے ایک ایسی چیز

سے رجوع کا باعث بن جائے جس کا ہم نے اپنے ''زمانۂ جاہلیت'' میں زور وشور سے تجربہ اور چرچا کیا، لیکن غبار چھٹنے پر معلوم ہوا کہ جسے ہم نسلی گھوڑا سمجھتے تھے، وہ تو دوغلا دراز گوش تھا، کسی بھی نئے کام میں شر وفتنہ سے بچنے یا خیر وبرکت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بڑوں کو کارگزاری سنا کر رہنمائی لینے کی عادت بنائی جائے، نیز ''استدراج'' سے بچنے کے لئے مسلسل دعا کی جائے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں محض اللہ کے فضل وکرم سے جلد ہی اس زہر ہلاہل کے جان لیوا نقصانات سے آگاہی ہوگئی اور اب ہم ہر اس شخص تک یہ بات پہنچانا اپنی شرعی ذمہ داری سمجھتے ہیں جو اس حسن میں امتزاج یا پلس میٹرک میں امتیاز کے جھانسے میں آچکا ہے۔ ابتدا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ایک دل سوز نصیحت سے کرتے ہیں، جنہیں اہلِ فکر ونظر نے گزشتہ صدی کا مجدد کہا ہے۔

مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ:

''یہ طریق مفید ثابت نہ ہوگا بلکہ مضر ہوگا، مدرسہ میں انگریزی داخل ہونے سے خلط مبحث ہو جائے گا، اب جو کام مدرسہ میں ہو رہا ہے۔ یہ بھی نہ ہوگا۔ مدرسہ ایک معجون مرکب ہو جائے گا۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ مدرسہ کو تو اپنی حالت پر رہنے دیجئے جو کام ہو رہا ہے، ہونے دیجئے اور انگریزی کے متعلق ایک درس گاہ الگ تیار کر دیجئے۔ اس کا نظم ونسق ان ہی حضرات کے ہاتھ میں رہے جو عربی کا نظم ونسق فرما رہے ہیں، دوسری جگہ پہنچ کر فارغ التحصیل طلبا کا بھی تعلیم انگریزی پانا مضرت سے خالی نہیں، ان کا یہ رنگ رہ ہی نہیں سکتا، یہاں سے الگ ہوکر ان کے جذبات کا محفوظ رہنا مشکل ہے، جس کا نتیجہ گمراہی ہوگا۔'' (تحفۃ العلما، ۲: ۱۲۷)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو ہمارے اکابر نے ''استاد الکل'' کا لقب دیا ہے کہ دیوبند کے گلہائے رنگارنگ سے لدی شاخوں کی اصل انہی سے جاملتی ہے۔ حضرت نانوتویؒ ان کے حوالے سے فرماتے ہیں:

> ''تجربہ شاہد ہے کہ جب نقد اور ادھار جمع ہوں تو ہر شخص نقد کو ترجیح دیتا ہے، ادھار پر راضی نہیں ہوتا، اب سمجھ لیجئے کہ علوم دینیہ اور تعلیم آخرت بمنزلہ ادھار کے ہے اور فنون دنیویہ بمنزلہ نقد کے ہے، جب دونوں جمع ہوں گے تو لوگوں کا میلان زیادہ نقد کی طرف ہوگا اور علوم دینیہ وآخرت مؤخر بلکہ غیر مقصود بن کر رہ جائیں گے۔'' (تحفۃ العلما، ۲: ۱۲۷)

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں شیخ العرب والعجم کا لقب

دیا گیا اور جو بہار و بنگال کے اسکول و مدارس کے لئے ایک جامع تعلیمی نظام کے تجویز کنندہ تھے، وہ اسکول کے نظامِ تعلیم کو اصلاح و ترمیم کے بعد بھی اسکول تک ہی رکھنے کے قائل تھے۔ دینی مدارس میں اس مغربی نظامِ تعلیم کو جسے غلط فہمی سے جدید کہہ دیا جاتا ہے کے داخلے کو انتہائی مضر قرار دیتے تھے، ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''ہم کو دنیا کے واسطے مدرسے قائم کرنے، اسکول قائم کرنے اور کالجوں کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں اور خاص کر مسلمانوں کی طرف سے اس کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ حکومت وقت کی طرف سے اس کے لئے کام کیا جارہا ہے، اس کے باوجود ایسے مدرسوں یا کالجوں وغیرہ کے قیام کی طرف مسلمانوں کی توجہ بہت زیادہ ہے، مگر دینی علوم کے لئے مدارس کے قیام کی طرف ان کی توجہ نہیں، انہماک نہیں، دنیا کے علوم کے لئے کتنی کوششیں کی جاتی ہیں؟ مگر یہ بتائیے کہ روحانیت کے واسطے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے لائحہ عمل کے واسطے دنیا کی تعلیم دینے والے اسکولوں کے مقابلہ میں کتنے مدرسے ہیں؟ ان کی تعداد مقابلتاً کتنی ہے؟ اور مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ان کی تعداد اور ان میں ان کی دلچسپی کتنی ہے؟

میرے بھائیو، بزرگو! سوچو، سمجھو! اگر آپ نے اس سحر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تو بڑی آفت میں مبتلا ہوجائیں گے، آنے والا زمانہ تاریک ہے، کوشش کیجئے اگر آپ نے دین سکھلا دیا تو پھر بچے کالج میں جائیں یا جہاں بھی جائیں ان کے پاس اسلام تو رہے گا، اسی واسطے علماء رات دن اسی فکر میں ہیں کہ دینی مدرسے ہر جگہ کھولے جائیں۔

میرے بھائیو! ہر جگہ خاص دینی مدارس کی ضرورت ہے، تاکہ وہ قیامت اور آخرت کو پہچان سکیں، اس کے بعد وہ جو چاہیں سیکھیں، دین دل میں بٹھا دیجئے انشاء اللہ وہ اس کی ہدایت پر چلتے رہیں گے اور ان کی دنیا بھی اچھی رہے گی اور آخرت بھی، تمام کو نیک توفیق عطا ہو۔ آمین الحمد للہ رب العالمین۔''

(قاضی زاہد الحسینی، چراغ محمد، سوانح حضرت شیخ الاسلام، ص: ۵۶۸ تا ۵۷۲)

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ:

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ وہ جہان دیدہ شخصیت تھے کہ عرب وعجم میں ان کے علوم و معارف کا ڈنکا بجتا تھا، آپ کا تعلق برصغیر کے دو ممتاز دینی تعلیمی نظاموں کے نمائندگان دارالعلوم دیوبند اور ندوہ میں سے مؤخر الذکر سے تھا۔ یہ ادارہ یا نظام وجود میں ہی اس لئے آیا کہ

تعلیمی نظام میں بہتری کی چند تجاویز کو عملی شکل دی جائے۔ حضرت علی میاںؒ اس کے ممتاز ترین فرزند تھے اور بعد میں سرپرست بھی، ایک دنیا دیکھ رکھی تھی۔ حضرت نے اپنے مشہور زمانہ اصلاحی بیانات ''پاجا سراغِ زندگی'' میں دینی مدرسہ میں رہتے ہوئے دنیاوی تعلیم کے حصول یا فکر کو ''ظلم عظیم'' اور ''خلافِ دیانت'' قرار دیا ہے۔ (ص: ۵) اگر دنیوی تعلیم کی اہمیت اس کے پاسنگ بھی ہوتی جتنی جتائی جارہی ہے تو وہ دنیوی تعلیم کے حصول کو ذہنیت کی تبدیلی، عقائد میں تزلزل اور دین سے انحراف کا سبب قرار دیتے ہوئے درج ذیل تبصرہ نہ فرماتے:

> ''جب کوئی ایسی قوم جو متعین ومحکم عقائد، مستقل فلسفۂ حیات اور مسلک زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ جو محض ماضی کا ایک ملبہ نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے، جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے، تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں پہلے ذہنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی و جزائی، انتظامات اس کی رفتار کو سست اور اس کے وقوع کو موخر کرسکتے ہیں، ملتوی نہیں کرسکتے۔ یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے، وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکاس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہلِ مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے، یہ نظام جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ذہنی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر ذہنی اور بعد میں (الا ماشاء اللہ) عینی ارتداد قدرتی ہے۔'' (حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ ''مغربی تعلیم کا زہر'' بحوالہ ماہنامہ ''وفاق المدارس'' ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ)

علامہ محمد اسد صاحب:

دینی تعلیم کے مراکز میں دنیوی تعلیم کے ان نقصانات پر ہمارے اکابر علماء و مشائخ کا ہی اتفاق نہیں، بعض نامور مفکرین و دانشور جنہوں نے عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گزار دی، اس موضوع پر دنیوی تعلیم کے فوائد گنواتے ہوئے ''رطب للسان'' نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم ایک

ایسی شخصیت کا تذکرہ کریں گے جو اسلام سے قبل یہودی المذہب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''أولئک یؤتون أجرهم مرتین '' کا مصداق بنایا۔ اللہ رب العزت ان کو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے سعادت مند رفقاء کی رفاقت نصیب کرے کہ انہوں نے ہمیں مغربی یا دنیاوی تعلیم کے نقصانات سے آگاہ کر کے خیر خواہی کا حق ادا کیا۔ اس سلیم القلب مغربی مبصر کا اسم گرامی علامہ محمد اسد تھا، ان کے ساتھ جیوش یا پولش نام "Leopopl" کا مطلب بھی وہی ہے جو اسد کا ہے۔ جناب اپنی مشہور زمانہ کتاب ''اسلام دوراہے پر'' میں فرماتے ہیں:

''ہم نے گزشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالف اسلام اثرات سے مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے۔ تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں، ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں، جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور کارفرما ہوتی ہے۔''

(Islam at the Crossroads,P:83-97)

اکبر الٰہ آبادی مرحوم:

غیر مسلم مغربی مبصر جو رازہائے درونِ خانہ سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، کے بعد ہم ہر مشرق کے ان اہل نظر و فکر کی طرف آتے ہیں جن کی ملی خدمات اور خیر خواہی مسلم ہیں۔ مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے دنیوی تعلیم پر بصیرت افروز حقیقت کشا تبصرے بڑے ظریفانہ انداز میں کئے ہیں اور حیرت اس پر ہے کہ ان میں سے چند بعینہٖ و بلفظہٖ درست ثابت ہوئے۔ مثلاً انہوں نے دنیوی تعلیم کے ایک بڑے نقصان کہ انسان اپنی ملت اور وطن کا تو کیا، والدین کا بھی وفادار نہیں رہتا، اپنے مفادات کا تابع اور شہوات کا غلام بن جاتا ہے، کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

ہم ان تمام کتابوں کو قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

حیرت انگیز تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ تبصرہ سب سے پہلے مغربی تعلیم کے مروج اول سرسیّد احمد خان اور ان کے بیٹے سید محمود خان پر صادق آیا۔ بڑے خان صاحب نے بڑے چاؤ اور شوق سے ایک گھر بنایا تھا۔ چھوٹے خان صاحب نے انہیں آخری عمر میں اس سے نکال باہر کیا۔ کہتے ہوئے دل دکھتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ خان صاحب جو پوری ہندوستانی ملت کا فائدہ صرف اور صرف مغربی تعلیم کی جلد از جلد ترویج میں سمجھتے تھے، ان کو خود اپنے فرزند ارجمند کو تعلیم دلانے کا فائدہ اتنا بھی نہ ہوا کہ اپنے گھر میں اپنے ورثا کے درمیان حیاتِ فانی کے آخری دن گزار سکتے۔ ان کا جنازہ لاوارثوں کی طرح غیروں کے گھر سے اٹھا۔ یہ المناک روداد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے، وہ سرسیّد کے آخری ایام کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کی زندگی کے آخری ایام انتہادرجے کی تلخی اور کرب والم میں گزرے، پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور دوسرا اس سے بڑھ کر سید محمود کا، کثرتِ شراب نوشی نے سیّد محمود کا دماغ مختل کردیا تھا اور وہ عالم دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابلِ برداشت نہیں ہوسکتی تھیں۔ سرسیّد کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تیس سال سے مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے اور ایک غیر گھر میں جاکر پناہ لینی پڑی۔'' (سرسیّد احمد خان، حالاتِ وافکار، ص:۸۵)

مولوی عبدالحق صاحب نے اس نقلِ مکانی کو گھر چھوڑنے سے تعبیر کیا ہے، لیکن میر ولایت حسین اپنی آپ بیتی میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''حاجی اسماعیل خان صاحب (سرسیّد) کو اپنی چھوٹی کوٹھی میں لے گئے، سید صاحب کو بے گھر ہونے سے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ منشی ناظر خان اور نجم الدین جو سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جس وقت سید صاحب حاجی اسماعیل خان صاحب کی کوٹھی پر پہنچے، ایک آہ کھینچی اور کہا کہ: ہائے افسوس! ہم کو کیا معلوم تھا کہ سیّد محمود آخر عمر میں ہم کو گھر سے نکال دیں گے، ورنہ کیا ہم اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک جھونپڑی بنالیتے؟ اس روحانی صدمے کا اثر سید صاحب پر ایسا ہوا کہ حاجی اسماعیل خان صاحب کی کوٹھی پر چند ہی دن رہنے پائے تھے کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا۔''

(سرسیّد احمد خان ایک سیاسی مطالعہ، ص:۳۰۶، بحوالہ حیاتِ سرسیّد، ضیاء الدین لاہوری، ص:۳۳۶)

اکبرالہ آبادی کا ایک اور شعر مشہور ہے جس میں انہوں نے یہ سنجیدہ تاریخی حقیقت بیان کی

ہے کہ اسکول و کالج کی مروجہ تعلیم درحقیقت مشہور فرعونی نسل کش نظریۂ سیاست ''**یقتلون ابناء ھم ویستحیون نساء ھم**'' کی ترقی یافتہ شکل ہے، شعر کچھ یوں ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس حوالے سے ان کا ایک اور شعر مشرق کی سادگی اور مغرب کی عیاری کی نقاب کشائی کرتا ہے:

مشرقی تو ہر دشمنی کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

علامہ شیخ محمد اقبالؒ:

علامہ اقبالؒ کی بلند فکری اور عمق نظری کا کون انکار کرے گا؟ انہوں نے بھی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا جس گہرائی سے جائزہ لیا، اس کا خلاصہ چند مصرعوں میں پیش کر دیا۔ تعجب ہے کہ ''اقبالیات'' پر پی ایچ ڈی کرنے والے مدارس پر پھر بھی نکتہ چینی اور کالج و یونیورسٹیوں کی ثناخوانی کرتے ہیں اور اس سے زیادہ تعجب ان دینی اداروں پر کیا جائے گا جو دنیوی تعلیم کے خان سامائی درجے کی میٹرک کو اپنے لئے مایۂ فخر قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کے مشرقی سانچے کو شکست و ریخت سے دوچار کر کے ان کی حقیقت و ماہیت تبدیل کر رہی ہے۔ اب کیا شک رہ جاتا ہے کہ یہ طلبا و فضلاء کی عقابی روح کا گلا گھونٹ کر انہیں ''**عبد الدینار والدرھم**'' بنا ڈالے گی۔ یہی وجہ ہے کہ این جی اوز اس کے لئے بے تحاشہ فنڈ فراہم کر رہی ہیں۔ یہ عاجز ڈیرہ غازی خان گیا تو ایک خیر خواہی فلاحی ادارے کے متعلق پتا چلا کہ اس کا مشن ہی یہی ہے کہ مدارس کا دورہ کر کے ان کو دنیویات پڑھانے والے اساتذہ، کتابیں وغیرہ مہیا کرے۔ احقر نے استفسار کیا کہ آپ کو اسپانسر کون کرتا ہے؟ انہوں نے کہا: بڑے بھائی! جو امریکا میں مقیم ہیں، وہ فنڈ بھیجتے ہیں۔ مکرر استفسار کیا: انہیں کون بھیجتا ہے؟ جواب ندارد۔ بہرحال علامہ اقبال کو سنئے، انہوں نے تو اس مغربی نظامِ تعلیم کا زخم کھایا تھا، فرماتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

(ضربِ کلیم)

ایک اور جگہ وہ اس حقیقت کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ ازوے روحِ قومے می تواں کشت

(ارمغانِ حجاز: ۱۴۴)

حد یہ ہے کہ وہ ''دینی تعلیم'' کے نام سے لکھے گئے چند اشعار میں مغرب کے اس نظامِ تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف سازش اور محکومی ومظلومی کا سبب قرار دیتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

(ضربِ کلیم، ص: ۷۰۸)

دنیوی تعلیم کے مجوز اوّل اور مروج اوّل:

اور واقعہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم کے زہر اور مدارس میں اس زہرناک تعلیم کے سرایت کر جانے کے بُرے نتائج صرف ہمارے اکابر ومشائخ کی فراست اور محبِّ وطن دانشوروں کے تجربات پر ہی موقوف نہیں۔ اگر ہم اس نظامِ تعلیم کے مجوز اوّل لارڈ صاحب (جو خیر سے یہودی النسل اور یہود کے بدنام زمانہ تنظیم فری میسن کے پہلے ہندوستانی لاج کے سربراہ اور برصغیر میں گرینڈ ماسٹر تھے) اور مروجِ اول خان صاحب (جو خیر سے ''محبانِ ملت'' انگریز کے خطاب یافتہ وساختہ پرداختہ تھے) کے ارشادات عالیہ پر بھیانک نظر ڈالیں تو بھی بات کافی حد تک سمجھ آجاتی ہے کہ یہی تعلیم مغرب میں ''وطن پرست شہری'' اور ہندوستان میں ''شکم پرست ہندوستانی'' کیوں پیدا کر رہی ہے؟

مشہور یہودی النسل انگریز ماہر تعلیم لارڈ میکالے ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے جو ہندوستانیوں کو جدید تعلیم مغربی زبان میں دینے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ آنجناب نے اس تعلیم کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے کہا:

''بالفعل ہم کو حتی الامکان ایک ایسا فرقہ مرتب کرنا چاہئے جو مابین ہمارے اور ان کروڑ ہا آدمیوں کے، جن پر ہم حکمران ہیں، متوسط ہو۔ اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو ازروئے مذہب کے مسلمان اور ازروئے لون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں

مگر باعتبارِ مذاق اور رائے وفہم کے انگریز ہوں۔'' (انتخاب مضامین انسٹیٹیوٹ گزٹ، مرتبہ اصغر عباس، اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنؤ (۱۹۸۲ء) ص:۵۶۵ بحوالہ ضیاء الدین لاہوری، نقش سرسید، ص:۶۳)

فکر ونظر اور اغراض ومقاصد کی یگانگت دیکھئے کہ ''مجوزِ اوّل'' اور ''مروجِ اوّل'' کے ''سینے کا درد'' ایک تھا، جس پر الفاظ کی یکسانیت گواہ ہے۔ علیگڑھ میں کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر وائسرائے لارڈلٹن کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، اس میں ''بانیانِ کالج کی نگاہ میں نمایاں مقاصد'' بیان کرتے ہوئے آخر میں اس کالج کے قیام کے اہم مقصد کا ذکر کیا گیا ہے:

''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق وکارآمد عایا بنانا اور ان کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں، بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔ من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبا کے دلوں میں حکومتِ برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیریکٹر کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حقِ امانت سے انحراف کے مترادف ہے۔'' (ایڈریس اور اسپیچز متعلق ایم اے او کالج، مرتبہ: نواب محسن الملک، انسٹیٹیوٹ پریس علیگڑھ (۱۸۹۸ء) دیباچہ، ص:۲ بحوالہ ضیاء الدین لاہوری، نقش سرسید، ص:۹۶)

آخری گزارشات:

دینوی تعلیم کے اغراض ومقاصد اور اثرات ونتائج پر ان تبصروں اور حوالوں کے بعد احقر اہلِ علم کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرے گا، یہ سارے ''نکات'' اس ''نقطے'' کے جائزے اور تبصرے کے گرد گھومتے ہیں کہ دینی مدارس میں دینوی تعلیم طلبا کی استعداد کو ''بہتر'' بنانے اور عصرِ حاضر کے ''رجل العصر'' بننے کی امید پر دی جارہی ہے۔ آیئے ذرا ان دونوں باتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ کسی کمزور استعداد والے کو وہ علوم وفنون استعداد فراہم کرسکتے ہیں:

۱:... جن کے پڑھنے پڑھانے والے اپنے بنیادی میدان اور اصل شعبے میں صاحبِ استعداد سمجھے جاتے ہوں۔ ''فاقد الشيء لایعطیه''۔

۲:... جن کی کسی دوسرے شعبے سے (جو نحیف الاستعداد ہے اور قوی الاستعداد بننے کا خواہشمند ہے) عقلی وطبعی مناسبت ہو۔

اسکول کالج کی جس تعلیم کو مدارس میں رائج کیا جارہا ہے، اس میں یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔ تفصیل اس اجمال کی ذیل میں ملاحظہ ہو، جو طویل تجربے اور عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے۔

مروجہ سرکاری دنیوی تعلیم میں تین رائج شعبے ہیں: سائنس، کامرس، آرٹس۔ ان کی درجہ بندی اسی ترتیب سے ہے، جس سے یہ ذکر ہوئے۔ ان میں سب سے کمزور اور ''**لکل ساقطة لاقط**'' کا مصداق تیسرا شعبہ ہے، جس کے ذریعے سے اہلِ مدارس کی استعداد کو جیک لگانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ پہلے دونوں ''باقاعدہ طالب علم'' (Regular) کے لئے خاص ہیں۔ اس شعبے کو سب سے پھسڈی طالب علم اور سب سے سکہ غیر رائج الوقت قسم کا معلم میسر آتا ہے۔ اسکول کالج کے عرف میں آرٹس کا گریجویٹ دنیا کا تھکا ہوا غیر ترقی یافتہ اسٹوڈنٹ باور کیا جاتا ہے اور جب دنیا کسی پر اپنے دروازے بند کرے تو وہ پیلے اسکول میں ماسٹری کے لئے منتخب ہوجاتا ہے، کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ جو چیز کسی کام کی نہ ہو، اس کے لئے ہمارے سینے کو سجاوٹ کے اعزاز سے نوازا جائے؟

پھر آرٹس کے ''میٹرک'' یا ''بی اے'' کے مضامین کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ دینی علوم سے ان کی مناسبت کا تناسب کیا ہے؟ ان میں سے کون سا ایسا ہے جو اسکول کالج کے آسمان پر چاند بن کر چمک چکا کہ اب اس کی روشنی سے مدارس والوں کو تاریک راتوں میں راستہ سجھائی دے گا۔ مدارس میں درجہ اولیٰ میں داخلے کے لئے میٹرک کی شرط لگائی جاتی ہے۔ میٹرک کا ایک مضمون بھی ایسا نہیں جس کا اُولیٰ کے مضامین (صرف، نحو، عربی، تجوید) سے کوئی خاص تعلق ہو۔ لے دے کے ارد ورہ جاتی ہے کہ امتحانی پرچے لکھنے میں آسانی ہوگی، لیکن یہی مقصد اُولیٰ سے پہلے یک سالہ ''تمہیدی عربی'' سے یا یک سالہ ''حفاظ عربی'' سے سو درجہ بہتر طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ طالب علم کو نحو وصرف اور عربی بھی نصف سے زیادہ آچکی ہوتی ہے اور وہ پرچے بھی عربی میں لکھنے کی استعداد حاصل کرلے گا۔ اگر مدارس میں ''اردو ادب کی تدریس وتمرین'' کا سلسلہ جاری ہوجائے تو اسکولی استعداد کی یہ آخری دلیل بھی خود بخود اپنی حیثیت کھو بیٹھے گی۔

۲:... آرٹس کے پانچ مضامین میں جو تھوڑی بہت جان ہے، یہ بھی اس وقت بے جان ہوجاتی ہے اور چارہ گر کا سارا چارہ بے چارگی میں بدل جاتا ہے، جب اسے ریگولر کے بجائے پرائیویٹ طور پر پڑھا جاتا ہے۔ پرائیویٹ امیداروں کی حد پرواز امتحانات سے چند دن پہلے نوٹس یا پھر سوالیہ پرچہ جات کے ذریعے تیاری شروع ہوتی ہے اور امتحان ہال میں بیٹھ کر کتا بچے چھاپنے پر ختم ہوتی ہے۔ دینی مدارس کے طلبا ہوں یا عوام پرائیویٹ امیدوار، ان کا کُل ''مبلغ علم'' یہی نوٹس ہوتے ہیں۔ اکثریت نے اصل کتاب کھول کر بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ اس تناظر میں خود اس دنیوی استعداد کی مضبوطی کا جو اپنی استعداد کو بہتر بنانے کے لئے حاصل کی جارہی ہے، کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ پھر بات یہ ہے کہ ہمارے یعنی پورے عالمِ سلام، شرق وغرب، عرب وعجم کے امیر ترین مما لک کے معیاری ترین دنیوی ادارے دنیا کی پہلی پانچ سو یونیورسٹیوں میں کہیں نہیں آتے۔ یعنی ہمارے ہاں کی ڈسٹ بن ایجوکیشن کی تو حیثیت ہی کیا، عالم اسلام کے امیر ترین ملک مل کر بھی ایک قابل ذکر

یا قابل فخر یونیورسٹی نہیں بنا سکے، جب قیمتوں کے بازار میں ان کی اپنی حیثیت یہ ہے تو وہ ہمیں کس عزت ومنصب سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں؟

۳:... دینی اور دنیاوی علوم میں ایک بہت بڑا فرق نیت، نظریئے اور ہدف کا بھی ہے۔ دینی مدرسے میں داخلے کے وقت پہلا سبق ''رضائے الٰہی'' کے حصول کے لئے ''تصحیح نیت'' کا اور رخصت ہوتے وقت آخری نصیحت امت کی ''صلاح وفلاح'' کے لئے ''فدائیت اور فنائیت'' کی ہوتی ہے۔ دنیوی اداروں میں ابتدائی سبق پیٹ اور جسم کی ضروریات اور شہوات کو پورا کرنے اور ''اعلیٰ مستقبل'' کے لئے محنت کرنے کا اور آخری عزم زیادہ سے زیادہ سہولیات ومراعات حاصل کرکے ریٹائرڈ ہونے اور اپنے پیچھے حب الوطنی اور انسانی دوستی کی ''بے مثال و ناقابل ذکر روایات'' چھوڑ جانے کا ہوتا ہے۔ دونوں کے یہاں اخلاص وایثار اور حب جاہ ومال کا جو نظریاتی فرق ہے، وہ آخر تک ان کے کردار اور کارکردگی میں جھلکتا ہے۔ دینی مدارس کے فضلاء کا (جن کو ابھی علیگڑھ تحریک کی ہوا نہیں لگی) ذہن یہ ہوتا ہے کہ وہ جتنی زیادہ مشقت اٹھائیں گے، اتنے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوں گے، جبکہ دنیوی تعلیم یافتہ حضرات ''پہلے پیٹ پُوجا پھر کم دُوجا'' کے اصول پر عامل ہوتے ہیں۔ خطیر قومی سرمائے کے بل بوتے پر برسوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی خواہش ہوتی ہے کہ پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر بیرون ملک کسی آنگن میں چہچہانے لگیں، آپ کو علاقے کے علاقے ایسے ملیں گے جہاں کوئی پرانا ڈاکٹر ہوگا نہ کوئی نیا میڈیکل گریجویٹ ہاؤس جاب کے لئے وہاں جانا چاہے گا، لیکن دین کے نام سے دور دراز دیہاتوں میں چھپر کے نیچے بیٹھے خدا مست فقیر ضرور مل جائیں گے، جو کچھ نہ لے کر بھی اس قوم کی متاع عزیز کی حفاظت کے لئے پہرہ دے رہے ہیں، جب مدارس میں دنیوی ڈگریوں کا چلن ہوجائے گا، تو وہاں بھی چٹائی کے بجائے کرسی، اور دال دلیے کے بجائے تنجن قورمے کا شوق پیدا ہوجائے گا اور ساری خیر وبرکت جو اس زندگی میں خلوص نیت اور زہد وقناعت کی برکت سے ہے، جاتی رہے گی۔ خدانخواستہ جب یہ متاع کارواں جاتا رہے گا تو کچھ عرصہ بعد احساس زیاں بھی رخصت ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ بُرے دن دیکھنے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

۴:... ایک بہت اہم چیز تجرباتی شواہد ہیں، جن حضرات نے خالص دینی تعلیم میں دنیاوی پچکاری کی کوشش کی، وہ طویل وجاں گسل محنت کے بعد ایک بھی ایسی مثال دینے سے قاصر وعاجز ہیں، جس کو دیکھنے والے بے اختیار اس ''حسین امتزاج'' کی افادیت کے قائل ہوجائیں، البتہ راقم فقط اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر ایسے بیسیوں فاضلان گرامی سے ملاقات وانٹرویو کر چکا ہے جو اگر خالص دینی تعلیم تک محدود رہتے اور اپنے دینی مطالعے کو ترقی دیتے تو بہت اچھے داعی بن کر احیاء واقامت دین کی کوششوں میں قابل قدر حصہ ڈال سکتے تھے، لیکن وہ اس ''حسین پچکاری'' کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوگئے تو پھر کہیں کے نہ رہے ''ولا ینبئک مثل مجرب'' جن حضرات نے یہ تجربات کئے، ان کی عمر بھر کی محنت کے حاصل وصول کا تجزیہ تحلیل کیا جائے تو کھدے پہاڑ سے برآمدہ ''فویسق''

(چو ہے) سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ جن حضرات نے دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرکے اپنے منصب و میدان کو نہ چھوڑا، بلکہ علم وحکمت اور دعوت وتحقیق کے جھنڈے گاڑھے، یہ وہ لوگ تھے جو بنیادی طور پر (چٹائی اور تپائی پر دی جانے والی) خالص دینی تعلیم کی پیداوار تھی، پھرانہوں نے اپنے بنیادی نظریئے اور ذہنی ساخت پر قائم رہتے ہوئے تخصصات یا خارجی مطالعے کے ذریعے کچھ ایسی مہارتیں حاصل کیں کہ مثالی خدمات انجام دینے کے قابل ہوگئے۔ اس سے کچھ حضرات کو غلط فہمی ہوگئی کہ ان کی استعداد کا رشاید اس ''حسین امتزاج'' کی مرہون منت ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی خدمات اس ''امتزاج'' کی نہیں ''استطلاع'' کے بل بوتے پر تھیں۔ یہ ''اطلاعاتی معلومات'' مہارتیں یا رو یئے کچھ بھی کہہ لیں کوئی سا نام بھی دیں لیں، بعداز فراغت منتخب لوگوں کے لئے مربوط نصاب کے ذریعے مرتب ماحول میں ہونی چاہئیں۔ ان کو ''درسِ نظامی'' کے دوران مدارس میں داخل کرنا یا درس نظامی کے بعد ہر ایک کے لئے جاری کرنا خودکشی کے ہم وزن وہم پلہ قسم کی غلطی ہے۔

۵:... جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ دنیوی علوم کی دینی علوم سے خاص مناسبت نہیں ہے، چہ جائیکہ انہیں مدارس میں داخلے کے لئے لازمی شرط یا موقوف علیہ بنایا جائے۔ میٹرک سطح کی انگریزی، سائنس یا مطالعہ پاکستان پڑھنے کے بعد اُولیٰ کے طالب علم کو ''نحو وصرف'' یا علوم عربیت سے کیا مناسبت پیدا ہوسکتی ہے اور جس معیار کی تعلیم ہمارے پبلے اسکولوں میں آرٹس کے عنوان سے ہے اور اہلِ مدارس کو چاروناچار اسی تیسری قسم پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ سرخ یا گلابی تعلیم (سائنس، کامرس) کے لئے ان کے پاس وقت نہیں۔ اس سے تو اردو کی دوسطریں یا اسلامیات کی دوسورتیں ''میٹریکولیٹ'' نامی مخلوق کو نہیں آپاتیں، چہ جائیکہ دوسرے مضامین میں کوئی دسترس حاصل ہو۔ میٹرک پاس کو تو رہنے دیجئے ایک گریجویٹ بھی جب پہلے دن ''بداں! أسعدک اللّٰہ تعالیٰ فی الدارین'' پڑھتا ہے تو اس کے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ میٹرک میں دس سال لگانے سے بہت بہتر بلکہ بدرجہا بہتر ہے کہ حفظ کے دوران قرآنی عربی اور حفظ کے بعد ایک سالہ عربی کا نصاب پڑھوالیا جائے۔ اُولیٰ کے آدھے سے زیادہ مضامین حفظ بھی ہوجائیں گے اور عمر بھر کے لئے درسِ نظامی آسان اور مضبوط بھی ہوجائے گا۔ جس طرح دورۂ حدیث سے پہلے چھوٹا دورہ (موقوف علیہ) ہے، اس طرح اُولیٰ سے پہلے یہ ایک طرح کا چھوٹا اُولیٰ ہے۔ ایک فطری، طبعی اور منطقی چیز جو اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے بہترین بنیاد ثابت ہوسکی ہے۔ اس کے مقابلے میں دو متقابل یا متضاد نظامِ تعلیم میں سے ایک کو دوسرے کی بنیاد یا شرط بنانا جتنا غیر فطری ہے، اتنا ہی اپنی میراث اور اکابر کے طرزِ عمل یا تاریخ کی نفری کے مترادف بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے اور اپنے اکابر کے طرزِ عمل اور ان کے دامن سے وابستہ رہتے ہوئے اس امانت کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے جو اللہ رب العزت کے فضل سے ہمارے پاس ''تراث الخیر'' کے طور پر محفوظ چلی آرہی ہے اور انشاء اللہ قیام تک محفوظ رہے گی۔ ☆

(بشکریہ: ماہنامہ ''وفاق المدارس'' شعبان ۱۴۳۳ء، ملتان)